شاہین اختر
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین ،لیہ

لسانی و بلاغتی مباحث اور ''فکر بلیغ'': ایک تحقیقی مطالعہ

Shaheen Akhtar

Department of Urdu, Govt. College for Women, Layah

The Linguistic and Rhetoric Discussions and *Fikr-e-Baleegh*

It has been the characteristic of Urdu literary, linguistic and rhetoric history that there has been deep contemplation over all these terms. The literary experst like shaikh Ahmed Gujarti, Mulla Wajhee, Mir Abdul Wasai Hanswi, Khan-e-Arzoo, Shah Hatim, Sayyed Insha, Moalana Baqir Aagah, Ahad Ali Khan Yakta, Imam Bakhsh Nasikh, Imam Bakhsh Sahbai have worked over these topics. In this way there has been made a strict tradition in Urdu literature regarding language, vhetoric, rhyme, prosody Byan and Badee. In this regard Allama Sayyed Ali Mohammad Shaad's book "Fikr-e-Baleegh" is a great refrence This book was published for the first and last time in near about 1920. This book is an examplary model of its age and its prose style. In this book there is a great debate over Urdu language history, rhetoics, Byaan, Badee, difinition of verse, Arifana Kalam and Gair Arifana Kalam, kind of verse and Mahasan and Mayaib-a-Kalam. One century ago, when there were no such great references over language contrversies at that time to lalk over such serious matters on such a logical and serious way was remarkable. In this regard this book can be regarded as a great reference.

اردو کے نثری ادب کا آغاز متصوفانہ موضوعات سے ہوتا ہے مگر بعد میں داستانوی نثر میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کی نثری تحریک جس کا زیادہ تر حصہ داستانوں پر مشتمل تھا، اس سے قبل مہر افروز دلبر (1752ء)، عجائب القص (1794ء) اور نو آئین ہندی یعنی قصۂ یوسف ملک وگیتی افروز (1795ء) جیسی داستانیں منصۂ شہود پر آئیں۔ ان داستانوں میں آخری دو داستانیں اٹھارویں صدی کی آخری دہائی میں تحریر کی گئی تھیں۔ ان کتب کا سادہ، صاف، سلیس اور رواں اسلوب اس بات کی دلیل ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے قبل وہ اسلوب اپنی شکل بنا چکا تھا جو بعد میں باغ و بہار، خطوط غالب اور تحریک علی گڑھ کے زیر اثر تخلیق ہونے والی نثر کے اسلوب کی بنیاد بنا۔ مراد یہ ہے کہ باغ و بہار سے پہلے رواں اسلوب سے مزین نثر، شمالی ہند کے ادبی اور تخلیقی تجربہ کا حصہ بن چکی تھی۔ ایسے اسلوب سے مملو کتب کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن پھر بھی یہ باعث غنیمت ہیں کہ اس دور میں اردو نثر لکھنے کا رواج پختہ ہو چکا تھا کیونکہ اس عہد میں اردو کی بجائے فارسی میں نثر لکھنے کا رجحان عام تھا۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> عام زندگی میں اردو شعراء اردو نثر میں فارسی تعلیم و تعلم کی بناء پر جو بُعد پیدا ہو چکا تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کلیات یا دواوین کے دیباچے اور تقریظیں فارسی میں ہوتی تھیں۔ شاعر اردو کے، لکھنے والے بھی اردو شاعر، لیکن تذکرہ قلم بند فارسی میں ہوتا تھا۔ (۱)

مگر انیسویں صدی کے آغاز میں اردو میں نثر لکھنے کا رواج عام ہوا۔ فورٹ ولیم کالج، خطوط غالب اور تحریک علی گڑھ کی نثر کے ساتھ ساتھ السنہ اور بلاغت کے مباحث پر کام کا آغاز بھی اسی صدی (انیسویں صدی) کی دین ہے۔ حدائق البلاغت (1842ء) معیار البلاغت (1860ء) اور بحر الفصاحت (86-1885ء) جیسی باکمال کتابیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اردو نثر میں اب سنجیدہ علمی موضوعات بھی پیش ہونے لگے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک تو اردو نثر نے کئی مراحل طے کر لیے تھے جس کے نتیجے میں مذکورہ موضوعات کو ایک مہمیز ملی اور ''فکر بلیغ'' ایسی کتاب سامنے آئی۔ یہ کتاب 1920ء کے لگ بھگ تحریر ہوئی اور اس کے مصنف مولانا علی محمد شادؔ ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں سید عابد علی عابد کہتے ہیں:

> تالیف مولانا علی محمد شاد، اس تالیف میں مولف نے جستہ جستہ فصاحت و بلاغت کے بعض پہلوؤں سے بحث کی ہے اور حق یہ ہے کہ بحث کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ (۲)

نہ جانے کس بنا پر سید عابد علی عابد نے یہ فرما دیا ہے کہ جستہ جستہ فصاحت و بلاغت کے بعض پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ 120 صفحات کی اس کتاب میں تقریباً 25 صفحات، فصاحت و بلاغت، کی بحث کے لیے مختص کئے گئے ہیں اور اس بحث میں انھوں نے فصاحت و بلاغت کی تعریف، تفاصیل اور دیگر بلاغتی پہلوؤں کو مدلل انداز میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور معائب و محاسن کلام کو وضاحت سے بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

> واضح ہو کہ اگر کوئی کلام نقائص بالائے سے پاک اور محاسن بلاغت رکھتا ہو تو اس کلام کی یوں تعریف کی جائے گی ''اس کلام کے سب الفاظ سلیس و شریں و متین اور محاورہ صحفا کے مطابق ہیں، سلسلۂ بیان اس کا درست

وچست اور معنی کے اعتبار سے عالی، مقتضائے حال سے ذرا بھی تجاوز نہیں ہے۔ (۳)

اس کتاب کا آغاز، حمید عظیم آبادی تلمیذ علی محمد شاؔد کے دیباچے بعنوان ''عرض حال'' سے ہوتا ہے اس کے بعد زبان فارسی میں ایک مثنوی ہے۔ جو 112 اشعار پر مشتمل ہے یہ دعائیہ مثنوی ہے جس کے شروع میں انھوں نے لکھا ہے:

میری تھوڑی سی نیکی (اگر ہو) تو اسے قبول کر لے اور میرے بہت سے گناہ بخش دے۔ (۴)

فصاحت و بلاغت کے بیان سے قبل انھوں نے ''زبان'' کے مباحث پر بات کی ہے اور اردو زبان کی تاریخ پر طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ مگر یہ بحث کرنے سے پہلے انھوں نے ملا محمد فائق کے حوالے سے مشہور نحوی سیبویہ کا یہ قول درج کیا ہے:

> اگر تم کو کسی زبان کی اصلیت و رکنیت دیکھنی ہو تو اس زبان کے مختلف لفظوں پر نظر کرو اور یہ دیکھو کہ اس زبان میں افعال و علامات خبر و ضمائر و اسمائے اشارہ کس زبان کے ہیں اور آیا تبدیل ہونے پر بھی وہ زبان اپنے مرکز پر قائم رہ سکتی ہے یا نہیں۔ (۵)

یہ قول درج کر کے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس معیار پر اگر جانچا جائے تو فارسی و عربی وغیرہ کوئی غیر زبان نہیں ٹھہرتی۔ سیبویہ یہ بھی کہتا ہے کہ جملوں میں مبتداء فاعل و مفعول و متعلقات جملہ کا اس معنی کر کے، اعتبار نہیں ہے۔ (۶) اس نظریے کی بنیاد پر علی شاؔد اردو زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> جتنی زندہ زبانیں موجود ہیں کم و بیش ان میں غیر زبانیں بھی مل گئی ہیں اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ زبان فلاں غیر زبان سے مرکب ہے بے شک ہماری زبان میں وہ گو کہ اصل زبان میں نہیں سہی فاعل و مفعول وغیرہ چند متعلقات جملہ میں بہت افراط سے فارسی وغیرہ زبانیں ایسی مل گئی ہیں کہ ان کا چھڑائے چھوٹنا اب نہایت ہی مشکل ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جب وہ الفاظ ایک مدت سے زبان میں مل کر کہیں اندک تغیر کے ساتھ ہیں کہیں بلا تغیر جزو واحد ہو چکے ہیں۔ فرض کرو کہ تعصب سے کوئی شخص اس لفظ کو ہٹا کر بجائے اس کے اپنے حسب خواہ دوسرا لفظ رکھے تو اول ہر زبان میں خدا جانے غیر زبانوں کے الفاظ متغیر ہو کر یا بجنسہ کس قدر مل گئے جن کا حصار ناممکن ہے تو چاہے کہ سب کے ساتھ ایسا ہی تعصب رکھے اور یہ ناممکن ہے۔ دوسرے اتنے بے گنتی الفاظ کا جو ہر اعتبار سے اب اسی زبان کے قرار دیئے گئے ہیں مروجہ زبان سے نکال نکال کر اجنب لغات و الفاظ کو داخل کرنے کی کوشش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ موجودہ فصیح و سلیس اردو کو نہ وہ جس میں کثرت سے زبردستی فارسی کی ترکیبیں الگ نئی نئی داخل کی جا رہی ہیں اور الفاظ الگ، دوسری طرف اچھے خاصے مستعمل لفظ کی جگہ سنسکرت کے اجنب الفاظ داخل ہو رہے ہیں۔ اگر مسلمان اور ہندو؛ دونوں اپنی متفقہ کوشش کر کے اور بھی پھیلانے کی تدبیر کریں تو شاید یہ زبان جو اس وقت دنیا بھر کی زبانوں میں شہرت پا چکی ہے عالم گیر اور علمی زبان ہو جائے۔ اس موجودہ سب طرح سے آراستہ زبان میں ایک جانب سے فارسی و عربی کے زیادہ کرنے اور دوسری طرف بھاکھا اور سنسکرت کے زیادہ لغات لانے کی کوشش سے یہ ہوگا کہ نہ اس میں

پوری کامیابی ہوگی نہ اس میں نتیجہ تنزل کے کچھ نہیں ہے۔ (۷)

سید علی محمد شادؔ کے اس طویل اقتباس میں یہ نکات سامنے آئے ہیں:

1- زندہ زبانوں میں غیر زبانوں کے الفاظ اس باریکی سے شامل ہو رہے ہیں کہ ان کی نشاندہی کرنا مشکل کام ہے۔ مگر یہ الفاظ ان زبانوں (زندہ زبانوں) کا حصہ بن چکے ہیں۔

2- اردو کے مستعمل الفاظ کی جگہ سنسکرت کے اجنبی الفاظ ہماری زبان اردو کے دامن میں داخل ہو رہے ہیں۔

3- اردو زبان دنیا بھر کی زبانوں میں شہرت پا چکی ہے اگر مسلمان اور ہندو اسے پھیلانے کی کوشش کریں تو یہ عالم گیر اور علمی زبان بن سکتی ہے۔

4- اگر اس میں بھاکھا اور سنسکرت کے زیادہ لغات لانے کی کوشش کی گئی تو نتیجہ اس کا زوال ہوگا۔

اس بحث سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں ہوتے ہیں کہ زبان اردو، فارسی، عربی اور مقامی زبانوں (بھاکھا اور سنسکرت وغیرہ) کے حصار سے نکل کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی ہے اور اس میں عالمگیریت اور علمیت کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ ان مباحث سے یہ بات ترشح ہوتی ہے کہ ''فکر بلیغ'' کی تخلیق کے وقت اردو لسان پر بات کرنے کا آغاز ہو چکا تھا کیونکہ اس کتاب میں شادؔ نے اردو زبان کے نام اور تاریخ پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور اپنی یہ رائے دی ہے۔

دراصل تو یہ زبان ہندوستانی ہے اور ہندوستانی ہی اس کے مالک ہیں پھر یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ غیر زبان دخل در معقولات دے۔ (۸)

دخل در معقولات کے منفی اثرات وہ یہ بتاتے ہیں کہ:

غیر زبان کے الفاظ کے ملنے سے فصاحت میں داغ لگتا ہے۔ (۹)

زبان کی بحث کی ذیل میں دراصل وہ فصاحت و بلاغت کے جملہ پہلوؤں کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں اور دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں کہ:

غرض یہ ہے کہ الفاظ رکیک، کڈھب، انکھڑ، متبذل، چھچھورے اور ایسے نہ ہوں کہ کانوں کو بھیانک معلوم ہوں۔ یہ بھی یاد رہے کہ فصاحت کے تین مدلول ہیں: لفظ فصیح۔ کلام فصیح، شخص فصیح۔ (۱۰)

فصاحت کی بحث میں ''شخص فصیح'' شاید پہلی مرتبہ شامل ہوا ہے۔ جس کی وضاحت میں وہ کہتے ہیں کہ شخص فصیح وہ کہا جائے گا کہ تقریراً اور تحریراً وہ فصیح جملے استعمال کرتا ہو۔ ایسے فصیح البیان کے لیے لازم ہے کہ لہجہ بھی اس کا درست ہو، لہجہ کی درستی کے یہ معنی ہیں کہ جس لفظ کو جس آواز اور جس ترکیب کے ساتھ بولنا خوش نما و خوش اسلوب و شیریں و دل پسند ہو اس سے عادتاً تجاوز نہ کرتا ہو۔ (۱۱) اسی فصاحت کی مزید وضاحت کے لیے انھوں نے آواز، سر اور موسیقی کو بھی اپنے مطالعہ کا حصہ بنایا ہے۔ دراصل فصاحت پر ان کا مدلل بات کرنے کا بنیادی مقصد بلاغت ہی کی تشریح و توضیح ہے:

میں نے مانا کہ مذکورہ بالا باتیں اسالیب بلاغت کو شامل ہیں مگر جو ضروری اور لازمی باتیں بلاغت کے لیے درکار ہیں ان کا اس صراحت میں کہیں پتا نہیں۔ واضح ہو کہ بلاغت عربی لفظ ہے جس کا ترجمہ ہماری زبان میں ''پہنچ'' ہے اس معنی کر کے کلام بلیغ کے معنی ہوئے پہنچا ہوا کلام۔ (۱۲)

''پہنچا ہوا کلام'' سے سید علی محمد شادؔ کی مراد یہ ہے کہ ایسا کلام جو معنوی اور لفظی اعتبار سے جامع اور اکمل ہو۔ نیز وہ مقتضائے حال کے مطابق ہو اور اسی میں کسی بھی طرح کے ایسے معائب یا سقم نہ ہوں جو طبائع انسانی پر گراں گزریں۔ یعنی برخلاف فطرت نہ ہوں۔ اس وضاحت کے لیے انھوں نے فصاحت اور بلاغت کے مباحث کو مختلف دلائل سے بیان کیا ہے۔ اس بحث کے بعد انھوں نے ''شعر'' کی تعریف اور ضرورت کو اقوال علمائے ادب عربی کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ شعر کی ذیل میں انھوں نے بیان، بدیع، عروض اور علم قافیہ پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور یہاں پر عربی کے ماہرین فصحا کے نظریات پر بھی ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

شعر، کلام موزوں و مقفیٰ کو کہتے ہیں کہ قائل نے بالقصد نظم کیا ہو۔ اس تعریف میں آخر کی دو قیدیں زائد معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اگر ایک ہی شعر ہوتا تو قافیہ کا پتا (جس کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ پیا پی لایا جائے) نہ لگے گا یا وہ اشعار جو بے اختیارانہ انسان نظم کر دیتا ہے شعریت سے نکل جائیں گے۔ اس لیے تحقیق مقام یوں ہے کہ شعر اسی کو کہیں گے کہ وزن مقررہ میں سے کسی وزن ہو رہا مقفیٰ بالقصد کہا جانا اس کا وصف اضافی ہے۔ (۱۳)

شعر کی اس تعریف کے ضمن میں وہ مزید کہتے ہیں کہ:

شعر کے کام اور مصرف کے بالا جمال سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی یاد رکھ لینی چاہیے کہ یہ کام وہی اشعار دیتے ہیں جو بحیثیت اپنی خوبی کے ''شعریت'' رکھتے ہیں ورنہ بعوض قوا کے جوش میں لانے کے اور بھی رندھا دیں گے۔ (۱۴)

یہاں یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ شعر کا بنیادی اور مرکزی جوہر اس کی ''شعریت'' ہے۔ اگر شعر میں سے شعریت ہٹا دی جائے تو وہ صرف ریاضی کا ایک فارمولا بن کر رہ جائے۔ مراد یہ ہے کہ سید علی محمد شاد کے نزدیک شعر ایسا کلام موزوں ہوتا ہے جس کا اساسی حوالہ شعریت ہے اور وہ اس شعریت کے بیان میں فصاحت، بلاغت، موسیقیت، سلاست، سر اور تفحص الفاظ؛ تمام کو زیر بحث لاتے ہیں اور یہیں پر ان اشعار کا احاطہ بھی کرتے ہیں جن میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کے مضامین باندھے گئے ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ استاد شعراء کے کلام سے امثلہ بیان کر کے عارفانہ اور غیر عارفانہ اشعار کا محاکمہ کرتے ہیں اور ان لفظیات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جن سے عارفانہ اور غیر عارفانہ موضوعات کی تخصیص ہوتی ہے۔ شعر کی بحث کے بعد اردو میں مستعمل اصناف شعر پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اقسام منظومات ہماری اردو میں بھی وہی ہیں جو فارسی میں رائج ہیں۔ یعنی غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، افراد، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، معشر، ترجیع بند، قصیدہ اور یہ سب انھیں عربی بحروں میں جن کو فارسی

والوں نے برتا ہے۔ (۱۵)

یہاں پر انھوں نے مرثیہ، حمد اور نعت پر نگاہ نہیں ڈالی جبکہ ہماری شعری تاریخ میں ان اصناف پر ایک بڑا سرمایہ موجود ہے۔ بہر حال ان کی طرف سے پیش کی گئی اصناف کو مفصل انداز میں زیر بحث لایا گیا ہے

الغرض ''فکر بلیغ'' اردو لسان کی وہ اہم کتاب ہے جس میں اردو زبان کی تعریف، تاریخ، اصول لسانیات، فصاحت، بلاغت، بیان، بدیع، قافیہ، عروض، شعر کی تعریف اور اصناف شعر پر مدلل اور مربوط انداز میں بحث کی گئی ہے۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ قدیم عہد ہی سے اردو کی ادبی، شعری اور لسانی تہذیب پر توجہ مرکوز کی جاتی رہی ہے اور بیان، بدیع، معانی، قافیہ، عروض، لسان روزمرہ کی درستی، اظہار کی صفائی، محاورے کی صحت اور زبان و بیان کے جملہ پہلوؤں پر ہر اعتبار سے بات ہوتی رہی ہے۔ اس کی بڑی دلیلیں ہم شیخ احمد گجراتی کی مثنوی، یوسف زلیخا (1585) میں دیکھ سکتے ہیں جس کے دیباچے میں کہا گیا ہے کہ وزن کی درستی کی خاطر کسی کلمے کا تلفظ بگاڑنا ٹھیک نہیں اور نہ ہی عبارت میں کسی قسم کی بے ربطی مستحسن ہے۔ ملا وجہی نے اپنی مثنوی قطب مشتری (1610ء) میں یہ فرمایا کہ زبان وہی فصیح ہوگی جس میں اساتذہ لسان کے عمل کی پابندی کی گئی ہو۔ میر عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' (1690ء) کو بنیاد بنا کر خان آرزو نے ''نوادر الالفاظ'' (1748ء) لکھی جس میں بعض لسانی مسائل بھی معرض گفتگو میں آئے۔ شاہ حاتم نے اپنے مختصر لیکن اہم دیباچہ ''دیوان زادہ (1755ء) میں معیاری زبان کے کچھ معاملات پر ضمنی اشارے کیے، اسی طرح سید انشا اور مرزا قتیل کی کتاب ''دریائے لطافت (1807ء) اور احد علی خان یکتا کی کتاب ''دستور الفصاحت (1815ء) ہے۔ ان کتابوں میں لسان، روزمرہ اور محاورہ وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے اور ادب عالیہ کے ان مباحث پر ناقدانہ اور محققانہ نگاہ ڈالی گئی جو نثری تخلیق کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ ''فکر بلیغ'' اسی سلسلے کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ لسان اور فصاحت و بلاغت کے باب میں یہ کتاب ہر اعتبار سے وقیع ہے۔ علامہ سید علی محمد شاد نے علمی اور تجزیاتی پیرائے اور مفصل صورت میں اپنا یہ تھیسز بیان کیا ہے:

> عرض میری سمجھ یوں ہے کہ ہمارے شعراء باعتبار زبان کے نہ تو ایسے ملا صاحب بن جائیں کہ اردو میں ترکیب ولغات فارسی وعربی کی ایسی بھرمار کر دیں کہ اس زبان کے بولنے والے کو اجنب معلوم ہو نہ ایسے پنڈت جی مہاراج ہو جائیں کہ سنسکرت و بھاشا کے غیر مروج لفظوں کا میل دے کر معمولی باتوں کو اشلوک بنا دیں۔ اعتدال کو ہر جگہ مدنظر رکھنا چاہیے۔ (۱۷)

سید علی محمد شاد اس فلسفہ سے آگاہ ہیں کہ زندہ زبانیں ارتقاء کرتی رہتی ہیں۔ ان کے محاورے اور روزمرہ میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ کیونکہ الفاظ اور اوران کے استعمال کے ردوقبول کا ''مسلسل عمل'' اس تبدیلی اور اس کے باعث زبان کی زندگی کا ضامن ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی، زبان کی تخلیقی توانائی کا باعث بن رہی ہے یا اسے نقصان دے رہی ہے۔ اس پہلو کے مدنظر زبان کو ردوقبول کے قابل بنانا ماہرین لسان کا بنیادی فریضہ تصور ہوتا ہے۔ ''فکر بلیغ'' آج سے تقریباً، ایک صدی قبل منصۂ شہود پر آئی، یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں ''لسانیات'' کے جدید مباحث، یہاں کے ماہرین لسان کے لیے اجنبی

اوراوپرے تھے۔مگر جس طرح ''فکر بلیغ'' کے خالق نے اپنے عہد کے مروج نثری اسلوب میں اپنے لسانی اور بلاغتی نظریات پیش کیے ہیں انھیں داد دیئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔اس کتاب کی اہمیت اور افادیت تاریخ تصنیف سے لے کر آج تک قائم ودائم ہے۔بطور خاص لمحہ موجود میں اس کتاب کی اہمیت وافادیت اور بھی بڑھ گئی ہے کہ میڈیا کی تیزی اور دنیا کا گلوبل ویلج میں تبدیل ہونے سے دنیا کی تمام زبانیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہورہی ہیں۔ایسے میں لفظوں کا ادھرادھر سفر کرنا ایک فطری عمل ہے، اس میں ''اعتدال'' کا دامن تھامے رکھنا اور زبانوں کی سائنس کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔اس تناظر میں ''فکر بلیغ'' ایک دستاویز کا مقام رکھتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، باغ وبہار کا مقدمہ، مشمولہ، مقدمات باغ وبہار، ڈاکٹر اسلم عزیز درانی، مرتب؛ (ملتان، کارواں ادب، 1995ء) ص ۱۶۳

۲۔ عابد علی عابد، سید، البدیع (لاہور: مجلس ترقی ادب 1985ء) ص ۹۲

۳۔ محمد علی شاؔد، علامہ سرسید، فکر بلیغ (پٹنہ، در مطبع سلیمانی، س۔ن) ص ۱۷

۴۔ فکر بلیغ، ص ۱ ۶۔ فکر بلیغ، ص ۴

۶۔ فکر بلیغ، ص ۵ ۷۔ فکر بلیغ، ص ۶

۸۔ فکر بلیغ، ص ۶ ۹۔ فکر بلیغ، ص ۱۱

۱۰۔ فکر بلیغ، ص ۱۲ ۱۱۔ فکر بلیغ، ص ۱۲

۱۲۔ فکر بلیغ، ص ۱۷ ۱۴۔ فکر بلیغ، ص ۴۷

۱۵۔ فکر بلیغ، ص ۹۰

۱۶۔ بحوالہ، خلیق، انجم (پیش لفظ) لغات روزمرہ، از شمس الرحمٰن فاروقی کراچی: سٹی پریس بک شاپ، 2003ء ص ۹

۱۷۔ فکر بلیغ، ص ۱۱۶